ہے۔ مشہور محقق مولوی اسماعیل پانی پتی نے اس کو ڈھونڈا۔ وہ لکھتے ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل ''میں پانی پت میں مولانا حالی کی لائبریری کا انچارج تھا۔ جب میں نے اس لائبریری میں مولانا کے مسودات اور تمام قلمی تحریریں یک جا کیں تو یہ مسودہ (یعنی مذکورہ مقالہ کا مسودہ) مجھے خود مولانا کے اپنے ہاتھ کا نہایت خوش نما لکھا ہوا ملا۔''

مولوی محمد اسماعیل پانی پتی مزید لکھتے ہیں کہ ''میرا اس مضمون کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر وقت گزرتا گیا اور میرا ارادہ عمل کی شکل اختیار نہ کر سکا، یہاں تک کہ وہ منحوس گھڑی آ گئی جب 1947ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا گھر بار، اپنی زمینیں، اپنے باغات، اپنا مال و اسباب اور سب سے بڑھ کر اپنی عظیم الشان اور نادرہ روزگار لائبریریاں چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ میں اُس وقت لاہور میں تھا اور میرے اہل وعیال پانی پت میں۔ نہ پوچھیے کہ ان پر کیا قیامت گزری اور وہ کس طرح بہ تباہ حال اپنے آبائی گھر سے نکلنے پر مجبور کیے گئے۔ وطن سے نکلتے وقت میرے لڑکوں محمد احمد (جسے مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے) اور مبارک محمود نے گھر میں سے کچھ نہ لیا۔ صرف میرے چند مسودات اٹھائے اور پاکستان روانہ ہو گئے۔ **شواہد الالہام** کا یہ مضمون بھی ان میں سے ایک ہے جو خوش قسمتی سے بچ رہا۔''

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس مقالے کا عنوان مولانا حالی نے **شواہد الالہام** رکھا تھا اور یہ مقالہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ پہلے حصے کا عنوان الہام اور وحی کی ضرورت پر تفصیلی دلائل اور دوسرے کا عنوان نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت تھا۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر مولانا نے اس کا دوسرا حصہ 21 اکتوبر 1885ء کے رسالہ **تہذیب الاخلاق** لکھنوء میں چھپوایا تھا۔ پہلا حصہ البتہ غیر مطبوعہ رہا اور آخر کار مولوی اسماعیل پانی پتی نے اُس کو لگ بھگ تین چوتھائی صدی کے بعد 27 اکتوبر 1964ء کے **منٹگمری گزٹ** میں پہلی بار شائع کروایا۔ اُس زمانے میں اس گزٹ کے نگران مصطفیٰ زیدی اور معاون خاص مجید امجد تھے۔ گویا **منٹگمری گزٹ** اپنے وقت کے دو بڑے شاعروں کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع صاحب نے ***المعارف*** کے لئے مولانا حالی کے مقالے کے پہلے حصے کو ایڈٹ کیا ہے۔ وہ اس کو ''مولانا الطاف حسین حالی کی عقلی اور منطقی بنیادوں پر مشتمل صلاحیتوں کی دلیل'' قرار دیتے ہیں۔ اس شمارے میں یہ مضمون اس لئے بھی شامل کیا جا رہا ہے کہ یہ انیسویں صدی میں مسلم الٰہیات کی تشکیل کی مختلف کوششوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

''وہ زمینی حقیقت بھی جنگ ہے یعنی دوسری عالمی جنگ جو یورپی اقوام اور ممالک نے اپنے مفادات کے لیے آپس میں لڑی۔ مگر ایٹم بم کا شکار ایشیا کا جاپان بنا۔ اور یہ نکتہ راقم پر جون 1997ء کوالالمپور، ملائشیاء میں ''محمد اقبال اور ایشیائی نشاۃِ ثانیہ'' (Muhammad Iqbal and the Asian Renaissance) کے عنوان سے بین الاقوامی کانفرنس میں اپنی پوری وضاحت کے ساتھ کھلا۔ راقم کی شرکت مصورِ اقبال کی حیثیت سے ہوئی اور اس کی اقبالیاتی مصوری کی نمائش جملہ تقریبات کا اہم حصہ تھی۔

سامعین! بات علامہ اقبال کے لیے عذاب بنی ہوئی دانشِ حاضر سے شروع ہوئی۔ جس دانشِ حاضر کے خدوخال اور شکل وصورت اجاگر کرنے کی کوئی بطورِ خاص کوشش کلام اقبال کے مبصّرین، محققین، مفسّرین اور شارحین کے ہاں آج تک کم کم نظر آتی ہے۔ راقم تو بس ایک مصور ہے جو اپنے ایزل کے ساتھ ایک کینوس کے سامنے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ میں رنگوں سے بھری پلیٹ ہے اور دوسرے میں برش ہے۔ وہ اپنے کینوس کے بے نشان اندر کسی نامعلوم کی تلاش میں نکلتا ہے تو اودھے اودھے نیلے نیلے پیلے پیلے سرخ سبز سرمئی اور چمپئی رنگ آپس میں مل مل کر اور بچھڑ بچھڑ کر ہم سمت ہم رنگ اور ہم آہنگ اس طرح ہوتے جاتے ہیں کہ میرا کینوس امکاناتِ نو بہ نو سے آباد ہو جاتا ہے۔ ان امکانات میں سے کوئی ایک میرا حجرہ بن جاتا ہے۔ میں اُس میں معتکف ہوتا ہوں تو میرا شاعر میرے موقلم پر اپنی فکر سے منکشف اور میرے کینوس پر اپنے شعر سے ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنے دشتِ جنوں میں کبھی جبرئیل کو شکار کرتا اور کبھی اپنی کمند یزداں پر آزماتا ہے۔ وہ شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن سے ہمکلام دکھائی دیتا اور کبھی شرابِ کہن اور تڑپنے پھڑکنے کی توفیق طلب کرتا نظر آتا ہے۔ وہ جامِ جہاں نما جامِ جمشید کو ٹھکراتا اور دستِ جہاں نما مانگتا ہے۔ وہ بندۂ مزدور کی تلخی اوقات کی اذیت سے گزرتا ہوا سفینۂ سرمایہ پرستی کو ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا شدت سے تمنائی ہے۔

وہ افلاک سے نالوں کا جواب سننے کے لیے اپنے سینے میں سیلِ معانی کو بصد مشکل ضبط کیے ہوئے کوہ دیاباں سے مثلِ سیلِ تند رو گزرتا ہوا گلستان راہ میں آئے تو وہ جوئے نغمہ خواں ہو جاتا ہے!

سامعین! جس طرح کینوس پر رنگ اور روشنی کو جدا جدا نہیں کیا جا سکتا نہ رنگ اور خیال کو الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح رنگ اور روشنی کو مثلث، مربع اور مستطیل میں مسدود و محدود کیا جا سکتا ہے نہ علامہ اقبال کے لیے عذاب بنی ہوئی دانشِ حاضر کو روز و شب اور ماہ و سال میں فصیل بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ حکمت و دانش کو گزشتہ حالیہ اور آئندہ زمانوں کے خانوں میں قطعی تقسیم کیا جا سکے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دانشِ حاضر کی وحدت کے اجزائے ترکیبی کے طور پر جو دانشیں اکٹھی ہو گئی ہیں ان کو ان کی انفرادیت کے ساتھ علیحدہ علیحدہ کیا جا سکے۔ اس کی مثال خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ''حکمتِ رومی'' سے یوں نقل کرتے ہیں کہ ''اگر تم مکان میں دس چراغ رکھو اور ہر چراغ الگ الگ شکل کا ہو۔ لیکن ان کی روشنی جو کمرے میں پھیل رہی ہے، تم اس کو الگ الگ نہیں کر سکتے کہ اتنی روشنی فلاں چراغ کی اور اتنی فلاں کی ہے۔ کیونکہ ان تمام چراغوں کا نور ایک غیر منقسم وحدت بن جاتا ہے۔ اس لمحے خوش قسمتی سے مجھے وہ التجا یاد آ گئی جو علامہ اقبال نے چارہ سازی کے لیے محمدِ مصطفیٰ سرورِ کائنات خاتم النّبیین رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کی ہے:

تو اے مولائے یثرب ﷺ آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

یعنی علامہ اقبال کے لئے جو دانشِ حاضر عذاب بنی ہوئی ہے، یہ طے ہو گیا کہ وہ ہندی، چینی، افغانی، ایرانی یا عربی نہیں ہے۔ وہ خالصتاً افرنگی دانش ہے۔ اب آگے ہم کچھ حساب کتاب سے باقی مشکل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کا سالِ پیدائش 1877ء ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی عمر کے تیئس برس انیسویں صدی سے لیے۔ آپ کا سالِ وفات 1938ء ہے۔ اس طرح انہوں نے باقی عمر کے اڑتیس برس بیسویں صدی سے حاصل کئے۔ چنانچہ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال کا دورِ حاضر لگ بھگ انیسویں اور بیسویں

صدی پر مشتمل ہے۔ اوراس حوالے سے اب ہمارے سامنے علامہ کے لیے عذابِ دانش حاضر کے خدوخال کافی واضح ہونے شروع ہوگئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

سامعین! انیسویں صدی کے بالکل آغاز میں برطانوی سائنس دان چارلس ڈارون (1809-1882) پیدا ہوا اُس نے The Origion of Species۔ جیسی کتاب لکھ کر یہ نظریہ دیا کہ پودے اور جاندار ایک لمبے عرصہ کے بعد نیچرل ورکنگ سلیکشن کے تحت اپنی شکلیں بدل لیتے ہیں۔ یہ نظریہ بائیبل اور قرآنِ مجید کے نظریۂ پیدائش سے متصادم ہونے کے باوجود انسانی ذہن کے لیے انقلاب آفریں ثابت ہوا۔

سامعین! انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جرمن سیاسی مفکر کارل مارکس (1818-1883) پیدا ہوا۔ فریڈرک اینجلو کے ساتھ مل کر 1848ء میں کیمونسٹ مینی فیسٹو لکھ کر جدید سوشلزم اور کیمونزم کی بنیاد رکھی۔ وطن بدری میں اس نے لندن میں قیام کے دوران ''داس کیپٹل''، جیسی شہرہ آفاق کتاب لکھ کر اشتراکی انقلاب کی راہ دکھائی۔

سامعین! انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں آسٹروی ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ 1856ء میں پیدا ہوا۔ جس نے تحلیلِ نفسی کی شہرۂ آفاق کتب: Interpretation of Dreams. The Ego.The Id. Dreams لکھ کر خاص طور پر ادب، مصوری، مذہب اور اخلاقیات کے تصورات کو درہم برہم کرنے کے علاوہ مادری پدری رشتوں کے تقدس کو تہلکہ خیز تعبیروں کے حوالے کر دیا۔

ڈارون، مارکس اور فرائیڈ کے آگے پیچھے فرانسیسی فلاسفر ہنری برگساں 1859ء میں پیدا ہوا۔ روسی ناول نگار لیو ٹالسٹائی 1826ء میں پیدا ہوا۔ عالمی امن کا علمبردار، ریاضی دان اور فلاسفر برٹرینڈ رسل 1872ء میں پیدا ہوا۔ 1874ء میں تاریخِ مصوری کی سب سے بڑی تحریک تأثریت (Impressionism) نے جنم لیا۔

سامعین! ہشیار باش کہ جرمن نژاد یہودی اور امریکن ماہر طبعیات البرٹ آئن سٹائن

علامہ اقبال سے دو برس چھوٹا یعنی 1879ء میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے عمومی اور خصوصی نظریۂ اضافیت سے ذہن انسانی کو ایک ایسے یکسر نئے اور انوکھے وژن سے آشنا کر دیا کہ یہ دونوں نظریے ایسے عجیب و غریب اور محیر العقل ہیں کہ ان کے نتائج پر قابو پا لینے کی صورت میں انسان اپنی موجودہ انسانی سطح سے یکلخت بلند ہو کر کسی اور نوع میں بدل جانے کی صلاحیت کا اہل بھی ہو سکتا ہے۔

سامعین! راقم نے اوپر جن بلند پایہ اربابِ فکر و نظر کا ذکر کیا ہے جن کے نظریات اور ان نظریات سے پھوٹنے والے طبعیاتی، مابعد الطبعیاتی، فکری، نفسی، سائنسی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مکاتب وہ اجزائے ترکیبی ہیں، جن سے وہ افرنگی دانش مرتب ہوتی ہے۔ جس کو علامہ اقبال دانشِ حاضر کہتے ہیں اور جس کی آتشِ عذاب میں وہ مثلِ خلیل ڈالے گئے ہیں اور اس دانش کی پرورش کرنے والے اور اِسے فروغ دینے والے فرنگستان میں مقتدر ملکہ وکٹوریہ (1819-1901) نے برطانیہ پر سب سے طویل حکمرانی کی۔ مسولینی اٹلی کا ڈکٹیٹر تھا (1883-1945) اس نے ایک نیا نظریہ فاشزم کے نام سے متعارف کروایا۔ ایڈلف ہٹلر (1889-1945) جرمنی کا چانسلر جو نازی پارٹی کا لیڈر تھا۔ سر ونسٹن چرچل (1874-1965) برطانوی سیاستدان جس کی سیاسی بصیرت کی مثال دی جاتی ہے دو بار وزیر اعظم برطانیہ منتخب ہوا۔ اس نے 2 انگلیوں سے پہلی بار V کا نشان بنایا۔ جس کا م مطلب VICTORY ہے۔ فرینکلن روز ویلٹ (1882-1945) امریکہ کا 23 واں صدر بنا اور اس امریکہ نے پہلا ایٹم بم استعمال کیا۔

سامعین! مندرجہ بالا صورتِ حالات میں علامہ اقبال کے لیے افرنگی دانش حاضر عذاب تھی۔ دوسری طرف وہ غلام ہندوستان کے شہری تھے۔ چنانچہ وہ اپنے کرب کا اظہار یوں کرتے ہیں:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

کیونکہ غلام ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کی تعلیم اور تصوف کی حالت اور کیفیت اس طرح کی تھی:

جلوَتیانِ مدرسہ کور نگاہ ومردہ ذوق
خِلوَتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

سامعین! کچھ ایسی ہی صورتِ حالات گیارہویں صدی عیسوی میں مسیحی یلغار کے آگے اسلام اور مسلمانوں کی تھی۔ الحرانی جیسے لوگ قرآن حکیم کی تفسیریں بھی لکھتے تھے۔ لیکن ذاتی طور پر مے نوشی اور سیہ مستی میں انہیں پس و پیش نہ ہوتا تھا اور وقت کا بادشاہ شراب نوشی کے باقاعدہ مقابلے منعقد کیا کرتا تھا۔ اس مایوس کن صورت میں امام غزالی نے قدامت پسند قوتوں میں ایک زبردست تازہ روح پھونک کر اصل اسلام کو بچالیا۔ یہی کام تیرہویں صدی میں مولانا روم نے کر دکھایا۔ اور تین سو سال بعد سترہویں صدی کے آغاز میں عہدِ جہانگیر میں یہی کارنامہ مجدد الف ثانی امامِ ربانی شیخ احمد سرہندیؒ نے سرانجام دیا اور ان کے بعد بیسویں صدی کا مفکر شاعر علامہ اقبال کہتا ہے:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

اور

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے شبانہ

سامعین! 1929ء میں شاعر اور مفکر علامہ نے اپنے شہرۂ آفاق چھ لیکچرز (خطباتِ مدراس) برِصغیر کی اعلیٰ علمی مجلس میں پیش کیے۔ 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسۂ الہ آباد کی صدارت کی۔ جس میں شمال مغربی ہند میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔ دوسری طرف انہی دو برسوں میں جو آپ کا اعلیٰ ترین تخلیقی کارنامہ ہے وہ ''جاویدنامہ'' کی تخلیق ہے۔ جس کے تعارف میں مفکر شاعر اقبال نے فرمایا:

آنچہ گفتم از جہانِ دیگر است
ایں کتاب از آسمانِ دیگر است

اس جاوید نامہ میں دورِ حاضر کے تمام جماعتی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں اور یہ بحثیں جاوید نامہ کے تمثیلی کرداروں کے مابین ہوئی ہیں اور کرداروں کی تعداد ۴۳ ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱ ابدالی: احمد شاہ درانی کی فوج کے ایک افسر تھے۔ بادشاہ کی وفات کے بعد آزادی کا اعلان کر دیا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ایما پر مسلمانوں کی حمایت میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی اسلام دشمن قوت کو تہس نہس کر دیا۔

۲ ابلیس: شیاطین کا جدِ امجد ہے اور آدم کو سجدہ نہ کر کے باعث راندۂ درگاہ ہوا۔

۳ اسقروطی: یہ حضرت عیسیٰؑ کا حواری تھا۔ مگر اس نے غدارانہ جاسوسی کر کے انہیں گرفتار کروایا اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر مصلوب کر دیا گیا تھا۔

۴ افرنگن: جاوید نامہ میں اس کا ذکر اسقروطی کے ساتھ آیا ہے۔ یہ آوارہ مزاج پری پیکر ایک عیار افرنگن ہے۔

۵۔ افلاطوس: یہودی حاکم جس نے عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کو مصلوب کیا تھا۔

۶۔ اہرمن: بدروح جو نمائندہ ابلیس ہے۔

۷۔ ابوجہل: اس بدفطرت نے ہجرت کے واقعہ سے قبل جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ غزوۂ بدر میں قتل ہو گیا۔

۸۔ بھرتری ہری: ایک راجہ زادہ تھا۔ فلسفہ، موسیقی اور مصوری پر دسترس رکھتا تھا۔ ایک دن تخت اور تاج چھوڑ کر جوگی بن گیا۔ اقبال نے جاوید نامہ میں اس کی اعلیٰ خصلت کی بنا پر اسے جنت میں دکھایا ہے۔

۹۔ ٹالسٹائی: روسی فلسفی ناول نویس اور افسانہ نگار۔ درویشانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس کی

کتابوں کے تراجم، دنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

۱۰ جمالِ: (حضور) خدا کی صفتِ جمال سے بحث کے دوران صفتِ جمال نے ظاہر ہو کر سلسلۂ بحث ختم کر دیا۔

۱۱۔ سید جمال الدین افغانی: اتحادِ عالمِ اسلام کے داعی اور اس عالمِ اسلام کو بیدار کرنے والے عظیم رہنما تھے۔

۱۲۔ جہاں دوست (وشوامتر) رام چندر جی کا اتالیق اور کالیداس کے مشہور ڈرامہ شکنتلا کی ہیروئن، شکنتلا کا والد۔

۱۳۔ جعفر از بنگال: میر جعفر علی خان نے پلاسی کی جنگ میں لارڈ کلائیو کے حق میں غداری کی۔

۱۴۔ حلاج: سرِ دار انا الحق کہنے والا اور کتاب الطّواسین کا مصنف۔

۱۵۔ حوارانِ بہشتی: جو جنت میں شاعر اقبال سے غزل سنانے کی درخواست کرتی ہیں۔

۱۶۔ روحِ ہندوستان: ایک تمثیلی کردار جو مجسم ہو کر غداروں کی کرتوتوں پر فریاد کرتا ہے۔

۱۷۔ رومی: مولانا جلال الدین رومی علامہ اقبال جن کے مرید ہندی ہیں

۱۸۔ زنِ رقاصہ: گوتم بدھ کے ہاتھ پر تائب ہونے والی ایک عورت

۱۹۔ زروان: زرتشتی روایات کے مطابق سیاہ و سفید چہرے والا ایک فرشتہ

۲۰۔ سروش: زرتشتی مذہب کا ایک مقرب فرشتہ

۲۱۔ سعید حلیم پاشا: ترکی کی اصلاحِ دین جماعت کا سربراہ جو وزیر خارجہ اور وزیر اعظم بھی ہوا۔ شہید کر دیا گیا۔

۲۲۔ سلطان شہید: والیٔ ریاستِ میسور سلطان فتح علی ٹیپو۔

۲۳۔ شرف النساء بیگم: زکریا خان گورنر پنجاب کی بیٹی جس کا مقبرہ بیگم پورہ لاہور "مائی سرو والی کا مقبرہ" کہلاتا ہے۔

۲۴۔ شاہِ ہمدان: وادی جموں و کشمیر کا ایک عظیم اصلاحی مبلغ اور کتاب ذخیرۃ الملوک کا مصنف

۲۵۔ صادق از دکن: سلطان ٹیپو کی فوج کا سالار، جس کی غداری سے شکست میں سلطان شہید ہوا۔

۲۶۔ طاہرہ بابیہ: قرۃ العین طاہرہ کے نام سے مشہور بابی خاتون۔

۲۷۔ غالب: اردو اور فارسی کا مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب۔

۲۸۔ غنی کشمیری: محمد طاہر غنی جو سبک ہندی کے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔

۲۹۔ فرعون: حضرت موسیٰ کا معاصر فرعون جس کی نعش (ممی) قاہرہ کے عجائب گھر میں ہے۔

۳۰۔ فرزمرز: ایک فرضی شیطانی کردار۔

۳۱۔ کچز: لارڈ کچز جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور فیلڈ مارشل کے عہدے سے نوازا گیا۔ اس کے ظلم و ستم کی وجہ سے اقبال اسے فرعونِ صغیر کہتے ہیں۔

۳۲۔ لات: قبیلہ ثقیف کا سورج دیوتا۔

۳۳۔ منات: قبیلہ خزرج کی دیوی (زن نمابت) جسے قضا و قدر کی مالکہ سمجھا جاتا ہے

۳۴۔ مہدی سوڈانی: مصر و سوڈان میں علمِ جہاد بلند کرنے والا مجاہد

۳۵۔ نادر شاہ افشاء: ہندوستان پر حملہ کرنے والا اور شعیہ سُنی اتحاد کا داعی

۳۶۔ ناصر خسرو: اسماعیلی عقائد رکھنے والا شاعر

۳۷۔ نبیہ مریخ: فلک مریخ پر جھوٹی نبیہ

۳۸۔ نسر: دو ستاروں کے نمونے پر کرگس کا ساتراشا ہوا بُت

۳۹۔ نیٹشے: جرمن فلاسفر فریڈرک نیٹشے

۴۰۔ طواسینِ رُسل: قرآنِ کریم میں طٰسٓ حروفِ مقطعات میں سے ہے۔

۴۱۔ یعوق: گھوڑے کی شکل کا بُت جسے حضرتِ نوحؑ کی قوم پوجتی تھی۔

۴۲۔ زرتشت: زرتشت مذہب میں ان کی کتاب ''اوستا'' الہامی مانی جاتی ہے۔

۴۳۔ گوتم بدھ: کپل وستو کا شہزادہ تھا۔ اصل نام سدھارتھ تھا ترکِ دینا کر کے جوگ کی راہ لی۔

قارئین: جاوید نامہ کے اِن تمثیلی کرداروں میں صفی بھی اور سفلی کردار بھی ہیں۔ ان میں محمود بھی اور مردود بھی ہیں۔ اعلیٰ بھی اور ادنیٰ بھی ہیں۔ وہ مختلف النوع بھی ہیں اور مختلف الفطرت بھی ہیں۔ شاعر اور مفکر اقبال کا ان کرداروں کے قالب میں ڈھلنا اپنے جملہ شاعرانہ اور مفکرانہ تخلیقی اور تقلیدی اوصاف کو ان کی تحویل میں دے کر ان کا بیانیہ بن کر پھر اپنے قالب میں مراجعت کرنا۔ ایک بے حد مشکل تبادلۂ کردار و افکار ہے۔ مثلاً جاوید نامہ میں ابوجہل کا جو نوحہ ہے اور شاعری میں ہے۔ یہ نوحہ ابوجہل کا ہے نہ شاعری اس کی ہے۔ یہ تو شاعر اقبال نے اپنی شاعری میں ابوجہل کی عین فطرت اور نوعیت کے مطابق خود ابوجہل کی جگہ یہ نوحہ لکھا ہے۔ اسی طرح سلطان فتح علی ٹیپو شہید کا پیغام جو دریائے کاویری کے نام ہے۔ یہ پیغام اور اس کی شاعری ٹیپو شہید کی نہیں ہے بلکہ شاعر اقبال نے شاعری میں ٹیپو شہید بن کر دریائے کاویری کے نام یہ پیغام منظوم کیا ہے۔ اور تو اور مولانا روم جو جاوید نامہ میں علامہ اقبال کے رہنما ہیں اور فارسی زبان کے بلند پایہ مستند شاعر ہیں۔ انہوں نے جو کچھ جاوید نامہ میں کہا ہے، اس میں صرف چند اشعار ان کے اپنے ہیں باقی ساری شاعری علامہ اقبال کی ہے۔ اسی طرح غالب کی ایک غزل اور ایک غزل قرۃ العین طاہرہ کی اپنی ہے۔ باقی فرعون سے لے کر کچز تک اور مہدی سوڈانی سے لے کر منصور حلاج اور روحِ ہندوستان سے لے کر حوران بہشتی تک ساری شاعری اقبال کی اپنی شاعری ہے چنانچہ اس جاوید نامہ کو ایک لاجواب آسمانی سفر نامہ بنانے کے لیے علامہ اقبال کے شعری وجدان اور روحانی ارتقاء نے عمودی اور افقی صعود و نزول کی تخلیقی وارداتوں میں اپنی ذاتی تخلیقی سلطنت کی فرمانروائی سے جگہ جگہ اپنے آپ کو معزول کر کے اپنی جگہ اپنے تمثیلی کرداروں کو تخت نشین کر دینا ایک اعلیٰ فلسفیانہ

وژن اور غیر معمولی شاعرانہ ظرف کا ہی کرشمہ شمار کیا جاسکتا ہے۔علامہ اقبال نے بجا طور پر فرمایا کہ جاوید نامہ لکھ کر ان کا دل اور دماغ نچڑ کر رہ گیا ہے۔علامہ اقبال کی اس تخلیقی مشقت واذیت کو سمجھنے کے لیے البرٹ آئن سٹائن جوان سے دو سال عمر میں چھوٹے تھے۔ وہ یاد آ گئے۔مسز آئن سٹائن بیان کرتی ہیں۔''پروفیسر ہمیشہ کی طرح اپنے ڈریسنگ گاؤن میں نیچے ناشتہ کے لیے آئے۔لیکن وہ کسی بھی شئے کو حقیقی رغبت سے چھو نہیں رہے تھے۔میں سمجھ گئی کہ وہ ذہنی طور پر کسی غیر معمولی خیال کے تعاقب میں ہیں۔میں نے پوچھا تو بولے''ڈارلنگ میرے دماغ میں ایک شاندار خیال آرہا ہے۔حیرت انگیز خیال''۔پھر وہ اٹھ کر اوپر اپنے سٹڈی روم میں چلے گئے۔مجھے بڑی تاکید سے کہا کہ وہ اپنے انہماک میں کسی بھی قسم کا خلل نہیں چاہتے۔وہ اپنے سٹڈی روم میں پورے دو ہفتے تک محدود رہے اور میں ان کا کھانا اوپر ہی بھیجتی رہی۔جب وہ اپنے سٹڈی روم سے نکل کر نیچے آئے تو بہت ہی پیلے پیلے نظر آرہے تھے۔ میرے سامنے میز پر انہوں نے دو کاغذ رکھتے ہوئے نہایت تھکاوٹ بھری ہوئی آواز میں کہا۔''یہ رہا اضافیت کا نظریہ۔''

سامعین! دنیا میں ایک سے ایک نابغہ اور عبقری ہوا ہے۔مگر بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو خود اپنے لیے اعلیٰ ترین مقاصد تخلیق کرتے اور ان مقاصد کی شایانِ شان تکمیل کی سعادت بھی حاصل کر لیتے ہیں۔علامہ اقبال ایسے بہت کم لوگوں میں سے ایک ہیں۔خطباتِ مدراس اور خطبۂ الہ آباد اور جاوید نامہ کی تخلیق و تکمیل کی اشاعت کے بعد اب حکیم الامت،شاعرِ مشرق علامہ اقبال اس خوشگوار احساسِ فراواں سے ہمکنار ہوتے لگتے ہیں کہ انہوں نے اپنے خداداد فلسفیانہ اور شاعرانہ جوہرِ تخلیق کا حاصلِ کامل پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی ملت اسلامیہ کو اس کی نشاۃ ثانیہ کی جانب مائل اور متحرک کرنے کے لیے ایک ولولۂ تازہ کی صورت میں فراہم کر دیا ہے۔چنانچہ اس احساسِ فراغت وفرصت کی فرحت نے علامہ اقبال کو ان کے ذہنی اور فکری ارتقاء کے اس ترفع کی تجلیوں کا بجا طور پر مرکز بنا دیا جہاں فلسفی شاعر بھرپور فکری تفاخر اور اعلیٰ شعری شکوہ کے ساتھ اپنا اثبات کرتا،اپنا اعتراف کرتا اور اپنے آپ کو تسلیم کرنے کے ساتھ باقاعدہ اس افتخار کو سیلی بریٹ کرتا نظر آتا ہے۔

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی

اور

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

اور

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و میگویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خودآگاہے!

سامعین! اپنے اس اثبات اور اپنے اعتراف نے علامہ اقبال کی ذات اور صفات میں مزید وسعت و رفعت اور ندرت و رجائیت شامل کر دی۔ اپنے جسمانی عوارض کے باجود ان کے فکر و نظر میں اس نئے احساسِ اطمینان کی فرحت و راحت کو تیسری گول میز کانفرنس لندن کا دعوت نامہ اور بھی طرب انگیز کر گیا اور وہ عیش و نشاطِ سیر و سیاحت کو اپنی جسمانی صحت کے لیے نیک شگون جانتے ہوئے بمبئی پہنچے اور سمندری جہاز سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ فرماتے ہیں: ''سمندری جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے، شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہے۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کو دیکھنا ہے۔ جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اے عرب کی سر زمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو معماروں نے رد کر

جس کو معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیمؐ بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں کر دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔۔۔۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں، جہاں کی گلیوں میں بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

سامعین! راقم ٹرینٹی کالج کیمبرج کے صدر دروازے پر کھڑا ہے اور اس وفد کا رکن ہے جو یہاں اس کالج میں شیخ محمد اقبال کے 1905ء سے 1908ء تک طالب علمانہ عرصہ کی یاد تازہ کرنے آیا ہے۔ اسی سلسلے میں ابھی ہم نے یہاں ایک سیشن میں ایک امریکن طالب علم کی تیار کردہ علامہ اقبال پر ایک ڈاکومنٹری دیکھی ہے جس میں راقم کی ایوانِ اقبال لاہور میں مستقل آرٹ گیلری سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اب اس ٹرینٹی کالج سے پیدل چل کر ہم لوگ بڑی سڑک پر دائیں ہاتھ چرچ آف آل سینٹس کے سامنے سے گزر کر ایک فرلانگ پر گول چوک سے بائیں ہاتھ مڑ کر سو گز چلنے کے بعد دائیں ہاتھ ایک گلی میں داخل ہو جاتے ہیں اور مزید ایک سو گز چل کر رک جاتے ہیں۔ ہمارے گائیڈ مشہور سائنسدان پاکستانی نژاد سعید اختر درانی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ جو دائیں ہاتھ مکان ہے اس کی دوسری منزل پر کمرے کی جو دیوار ہمارے سامنے ہے اس پر دیکھئے وہ یادگاری تختی نظر آ رہی ہے۔

سامعین! راقم آپ سے ایک فلیش بیک (Flash back) کی اجازت چاہتا ہے۔ جس میں وہ آپ سب کو علامہ اقبال کے شہر لاہور کی مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی کے اقبال کیمپس میں لیے جا رہا ہے۔

سامعین! اقبال کیمپس، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے فارمیسی کالج میں میری کلامِ اقبال کی مصوری کی گیلری ہے۔ جسے دیکھنے میں وہاں بہت دنوں بعد گیا تھا۔ گیلری میں طالب علم لڑکے اور لڑکیوں نے مجھے پہچان لیا۔ ان کے اور راقم کے مابین مکالمہ کے سوال و جواب میں علامہ اقبال کا تصورِ عشق مرکزی موضوع رہا اور عشق کے فلسفیانہ تصور کی بجائے ان طلبا و طالبات کی مراد وہ عشق تھا

جو بقول ان کے ایک He کو کسی اپنی She کلاس فیلو کے ساتھ یا کسی She کو اپنے کسی He کلاس فیلو کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس رومان انگیز طالب علمانہ خوش کلامی میں راقم ان سے متاثر اور وہ راقم سے محظوظ ہوتے رہے۔ واپسی پر یونیورسٹی گیٹ کے قریب کاغذ کا ایک پرزہ عجیب انداز میں جھومتا جھولتا ہوا میرے آگے آگے اُڑنے لگا۔ مجھے متوجہ کرنے کے کرتب دکھاتا ہوا کچھ ہی فاصلے پر ایک پودے کے پتوں میں اٹک گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔

سامعین! آپ نے گلی کوچوں میں سڑکوں اور بازاروں میں تفریح گاہوں میں کاغذ کے پرزے چننے والے دیکھے ہوں گے۔ میں بھی کاغذ کے پرزے چننے والا ایک طالب علم ہوں، مصوری کا طالب علم، ادب کا طالب علم، تاریخ کا طالب علم، تہذیب کا طالب علم، تمدن کا طالب علم، پاکستان کا طالب علم، امن اور انسانیت کا طالب علم ہوں۔ میں جس علاقہ میں اکثر پرزے چنتا ہوں اس میں شامل نیشنل کالج آف آرٹس، لاہور میوزیم، پنجاب پبلک لائبریری، پنجاب یونیورسٹی، یونیورسٹی لائبریری، لاء کالج، اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ہے، میں جو پرزہ اُٹھاتا ہوں، پہلے اُسے چومتا ہوں آنکھوں سے لگاتا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ اس میں میرے لیے علم ہے، میرے لیے آگہی ہے اور یہ پرزہ میرے نام دراصل ایک خط ہے جو لے کر ہوا آتی ہے اور ہوا ازل کی حقیقی اور سچی نامہ بر ہے اور یہ نامہ جو یونیورسٹی گیٹ پر ہوا مجھے ابھی ابھی دے گئی ہے۔ یہ ماہنامہ ''افکار'' کراچی نومبر 1982ء کا پرزہ ہے۔ اس پر علامہ اقبال کا خط ہے۔

سامعین! اقبال فرائیلائین ایما ویگے ناسٹ کے نام لکھتے ہیں: ''آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے۔''

''میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے...... ایما۔ اور یہ ہمیشہ مجھے ان سہانے دنوں کی یاد دلاتا ہے، جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چند روز کے لیے ہائیڈل برگ آسکوں لیکن اگر ممکن ہو تو کیا آپ پیرس میں مجھے مل سکتی ہیں۔

''مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب میں آپ کے ساتھ مل کر گوئٹے کا کلام پڑھا کرتا تھا اور میں اُمید

کرتا ہوں کہ آپ کو بھی وہ خوشیوں بھرے دن یاد ہوں گے جب ہم ایک دوسرے سے (گویا روحانی طور پر) اس قدر قریب تھے۔ میرا جسم یہاں ہے اور میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔ آج کل بہار کا موسم ہے۔ سورج مسکرا رہا ہے لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے کچھ سطریں لکھئے اور آپ کا خط میری بہار ہوگا۔ میرے دلِ غمگیں میں آپ کے لیے بڑی خوبصورت سوچیں ہیں اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آپ کے لیے میری تمنائیں۔ مت بھولیے گا کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے۔ ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا اور یاد رکھئے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے۔ اگر چہ وہ فاصلہ دراز پر ہے۔ جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔"

"یہ بات میرے لیے ناممکن ہے کہ میں آپ کے اس خوبصورت ملک کو بھول جاؤں، جہاں سے میں نے اتنا کچھ سیکھا ہے۔ ہائیڈل برگ میں میرا قیام اب سوائے ایک حسین خواب کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اے کاش کہ میں اسے پھر سے دہرا سکتا۔ میں جرمنی کو بہت چاہتا ہوں۔ اس نے میرے آدرشوں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور میں وہاں اپنے قیام کو کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ میں تاعمر ان ایام کو نہ بھول سکوں گا۔ جب آپ مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھاتی تھیں اور میری ہر طرح سے مدد کرتی تھیں۔ وہ کیا ہی مسرت افزا دن تھے!"

"میری بڑی آرزو ہے کہ میں آپ سے ہائیڈل برگ یا ہائیل براؤن (Heilbrown) میں دوبارہ مل سکوں تاکہ ہم دونوں پھر ایک ساتھ وہاں سے اس پیر طریقت گوئٹے کے مقدس مزار کی زیارت کو جاسکیں۔"

"اگلے روز میں ہائنے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ دن پھر میری نظروں میں گھوم گئے۔ جب ہم ایک ساتھ اس کا کلام پڑھا کرتے تھے۔

"جرمنی میرے لیے گویا ایک دوسرا روحانی گھر تھا۔ میں نے وہاں سے بہت کچھ سیکھا اور وہاں

بہت کچھ سوچا۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح میں ایک دائمی جگہ پالی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنی زندگی کے لمحۂ آخریں میں کیا کہا: ''مزید روشنی''، موت ہمارے لیے وہ دروازہ وا کرتی ہے اور ہمیں اُن منزلوں تک پہنچاتی ہے جہاں ہم دائمی حسن وصداقت کے روبرو ہوتے ہیں۔

''مع ہذا میں اپنی ایک تصویر ملفوف کر رہا ہوں۔ شاید میں ایک اور تصویر آپ کو بھیجوں گا۔ آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے۔''

سامعین! اقبال کی میز پر ایماویگے ناسٹ کی تصویر کا زمانہ 1908ء اور مقام لندن ہے۔ اقبال واپس وطن آجاتے ہیں۔

- ☆ 1910ء تک "Stray Reflections" کے عنوان سے اپنے تاثرات انگریزی زبان میں لکھتے رہے۔
- ☆ 1911ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم ''شکوہ'' پڑھی۔
- ☆ 1912ء میں باغ بیرون موچی دروازہ میں نظم ''جواب شکوہ'' پڑھی اور نظم ''شمع وشاعر'' انجمن حمائت اسلام کے جلسے میں سنائی۔
- ☆ 1914ء میں فارسی شاعری کا مجموعہ ''اسرارِ خودی'' شائع ہوا۔ والدہ امام بی بی کے انتقال پر ''والدہ مرحومہ کے نام'' ایک بے مثال طویل مرثیہ لکھا۔
- ☆ 1915ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ جس میں جرمنی بڑا حریف تھا اور بہت بڑی بربادی سے گزرا۔ مختلف ذرائع سے بصد مشکل ایماویگے ناسٹ کا اتا پتا اور خیریت کی خبر اقبال کو ملی۔
- ☆ 1918ء میں دوسرا فارسی مجموعہ ''رموزِ بیخودی'' شائع ہوا۔
- ☆ 1919ء میں اقبال نے علی برادران کی رہائی کی خوشی میں اپنی نظم ''اسیری'' سنائی۔
- ☆ 1920ء میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر اے نکلسن نے کیا۔
- ☆ 1922ء میں نظم ''خضر راہ'' انجمن حمائت اسلام کے جلسے میں پڑھی۔ مصطفےٰ کمال کی

قیادت میں ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی تو اقبال نے مشہور نظم ''طلوع اسلام'' لکھی۔

☆ 1923ء میں تاجِ برطانیہ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب ملا۔ ''پیامِ مشرق'' شائع ہوئی۔

☆ 1924ء میں اردو شاعری کا اوّلیں مجموعہ ''بانگِ درا'' شائع ہوا۔

☆ 1927ء میں ''زبورِ عجم'' شائع ہوئی۔

☆ 1929ء میں مدراس میں اقبال کا پر تپاک خیر مقدم ہوا اور اقبال نے مشہور خطبات دیے۔ مدراس کے بعد بنگلور میں مثالی استقبال ہوا۔ سرنگا پٹم گئے اور سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر حاضری دی۔ میسور میں اقبال کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

☆ 1930ء میں ''خطباتِ مدراس'' کی اشاعت ہوئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ الٰہ آباد کی صدارت کی اور اس میں شمال مغربی ہند میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔

☆ 1931ء میں بذریعہ سمندری جہاز دوسری گول میز کانفرنس کے لیے لندن پہنچے۔ لندن سے بذریعہ ٹرین اٹلی پہنچے اور میسولینی سے ملاقات کی۔ وہاں سے بذریعہ سمندری جہاز مصر پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ٹرین فلسطین گئے۔ بیت المقدس میں بسلسلہ ''اسلامی کانفرنس''، مفتی اعظم امین الحسینی اور دیگر فلسطینی زعماء نے شاندار استقبال کیا۔ اس کانفرنس کے چار نائب صدور میں ایک اقبال بھی منتخب ہوئے۔ سمندری جہاز سے بمبئی پہنچے اور بذریعہ ٹرین وہاں سے لاہور آئے۔

☆ 1932ء میں ''جاوید نامہ'' شائع ہوئی۔ پہلا یومِ اقبال 6 مارچ کو منایا گیا۔ لاہور سے بسلسلہ ''تیسری گول میز کانفرنس'' برائے لندن روانہ ہوئے اور شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر لندن سے پیرس پہنچے اور مشہور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات کی۔

سامعین! فرائیلائین ایما ویگے ناسٹ کو اقبال نے لندن سے خط مورخہ 29 نومبر 1932ء کے ذریعے اطلاع دی: ''میں اپنے پروگرام کے مطابق ہائیڈل برگ 18 جنوری 1933ء کی رات 10 بج کر 30 منٹ پر پہنچوں گا اور ہوٹل بیئرشر ہوف (Hotel Bayerisher Hof) میں ٹھہروں گا۔''

سامعین! ہائیڈل برگ کے ہوٹل بیئرشر ہوف کے سامنے راقم اسلم کمال 18 جنوری 1987ء دن کے 11 بجے کھڑا سوچ رہا ہے کہ اقبال نے ہائیڈل برگ پہنچنے اور اس ہوٹل میں ٹھہرنے کی اطلاع ایما ویگے ناسٹ کو دے کر چند ہی دن بعد یہ دوسری اطلاع کیونکر دے دی کہ ان کا ہائیڈل برگ آنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ تو بہت غیر متوقع پریشان کن اور دل شکن اطلاع تھی۔ 1908ء سے 1933ء تک 23 برسوں پر محیط ہجر و فراق کے شکار دلِ غمگیں کے لیے نشاطِ وصل کا جو موقعہ حسن اتفاق سے پیدا ہوا اور دیدارِ یار کی اُمید کی جو روشنی دل و جاں میں لمحہ بہ لمحہ پھلتی چلی آ رہی ہے اور دم بہ دم باعثِ تسکین روح و جاں بنتی جا رہی ہے۔ ایسی دل افروز اور روح پرور روشنی کو ایک بساط کی طرح لپیٹ کر دل کے دروازے کے باہر رکھ دینا بڑی ہی عجیب و غریب بات ہے۔ یہ تو اپنے ہی ہاتھوں سے دلِ غمگین کو اور ویران اور روح کو اور سنسان کر لینے والی ایسی بات ہے جو خاص طور پر اقبال کی آرزو آموزی اور اُمید پروری سے میل نہیں کھاتی۔

سامعین! راقم ہائیڈل برگ کے ہوٹل بیئرشر ہوف کے سامنے دن کے گیارہ بجے جس سوچ میں گم تیس برس پہلے کھڑا تھا۔ وہ سوچ تا دمِ تحریر 2018ء تک اُسی طرح راقم کے شعور میں روشن ہے۔ یہ ماند نہیں پڑی۔ یہ ذرّہ بھر بھی دھندلائی نہیں ہے۔ اس سوچ کے سارے پہلو اور تمام زاویے اس سوچ کی سب کرنیں اور سب شعاعیں جن جن سرچشموں سے پھوٹتی ہیں ان کی صداقت مسلمہ ہے لیکن وقت نام کا ایک دھوبی چشمہ آبِ حیات پر ہمیشہ سے ہمیشہ کی طرح ہر شے اور ہر شے کو بار بار دھو رہا ہے۔ آثار کا تزکیہ کرتا ہے۔ احساس کو پاک کر رہا ہے۔ الفاظ کو اُجلا کرتا ہے۔ اجسام کو لطیف بنا رہا ہے۔ اظہار کو نکھار دیتا ہے، اشعار کو سنوار دیتا ہے اور اقبال کو بلند اقبال کر

دیتا ہے۔ اقبال ہائیڈل برگ جانے کا پروگرام ختم کر کے جنوری 1933ء کے اوائل میں سپین پہنچتے ہیں۔ اس سفر میں ان کی ایک ڈائری کھو جاتی ہے۔ جو پھر نہ مل سکی لیکن اس کا افسوس عمر بھر رہا۔ ان کے ہمراہ ان کی انگریز پرائیویٹ سیکرٹری ان کی جانب اپنا طرزِ عمل اچانک بدل لیتی ہے اور اقبال کی خدمت یوں کرنے لگتی ہے جیسے وہ ان کی پرائیویٹ سیکرٹری نہیں بلکہ ایک مرید تھی۔ اس نئے طرزِ عمل کی وجہ پوچھنے پر اقبال سے اُس نے کہا: ''مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ آپ ایک آسمانی وجود ہیں۔'' صنفِ نازک سے ایک غیر مذہب اور پرشباب ہم سفر کے اس اچانک انکشاف کے حیات افروز اور روح افزا احساس کے ساتھ اقبال سیاحتِ ہسپانیہ کرتے ہیں۔ وہاں کے تاریخی آثار کے تہذیبی تفاخر نے ان کی شعری لفظیات کو پرشکوہ کر دیا اور گمشدہ اذانوں کی جا بجا بازگشت نے جہاں ان کی شعری صوت کو یمنی حجازی لحن آشنا کر دیا وہاں مسجد قرطبہ کے تعمیری حسن و جمال اور توازن و تناسب نے بھی ان کی تخلیقی دانش کو معنی آفرین و عہد آفریں بنا دیا ہے۔

سامعین! اقبال 24 جنوری 1933ء کو میڈرڈ یونیورسٹی میں (Spain and Intellectual World of Islam) کے عنوان سے لیکچر دیتے ہیں اور 12 جنوری سے 24 جنوری 1933ء تک میڈرڈ میں قیام کرتے ہیں اور قیام کے اس عرصہ کے عین وسط میں 18 جنوری کی رات بھی پڑتی ہے جس رات اقبال نے ہائیڈل برگ میں ہونا تھا۔ اقبال کو وہ رات اس رات ضرور یاد آئی ہوگی اور یاد آ کر اقبال کے دلِ غمگیں میں ٹھہر بھی گئی ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے کہ خود اقبال کے دلِ غمگیں نے اس رات یہ سوال بار بار پوچھا ہو کہ یہ ہائیڈل برگ کا پروگرام اتنی آسانی سے کیوں بدل لیا تھا۔ لندن سے پیرس جا کر فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات ہو سکتی ہے تو پیرس سے ہائیڈل برگ کا فاصلہ ایسا بھی کوئی فاصلہ نہیں ہے جبکہ طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے...... پروگرام میں اگر تبدیلی ناگزیر تھی تو اس تبدیلی کے مطابق فرائیلائین ایماویگے ناسٹ سے ملاقات کے پروگرام کو بھی معرضِ التوا میں رکھا جا سکتا تھا۔ مگر آپ تو سیاحتِ ہسپانیہ کے ولولۂ والہانہ میں یوں لگتا ہے اُس ایماویگے ناسٹ کے ساتھ شوقِ ملاقات سے ہی دست بردار ہو گئے

ہیں۔ جس کی شخصیت میں گوئٹے، ہائنے، نیکر، ہائیڈل برگ، کانٹ، شوپنہار، جرمنی اور جرمنی کے ایامِ بہجت مجسم ہو گئے تھے۔

سامعین! یہ تو کوئی دل ہی جانتا ہے کہ اقبال نے کس دل سے ہائیڈل برگ نہ جانے کا فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اقبال کا یہ فیصلہ کوئی جبریہ یا نادانستہ نہیں تھا۔ بلکہ مکمل طور پر اختیاری اور کلی طور پر شعوری فیصلہ نظر آتا ہے۔ جو ایک طرف اقبال کی عاشقی، اُداسی، آشفتگی، وارفتگی، درویشی اور دیوانگی و دل سوزی سے کوئی ایسی شاعرانہ نسبت نہیں رکھتا لیکن دوسری طرف اس فیصلے کو اقبال کے اُس مجتہدانہ مزاج کی پوری پوری تائید وحمایت حاصل نظر آتی ہے جس کے وہ زبردست داعی اور معلم ہیں اور جس کے فروغ کے لیے وہ اپنے بحرِ تخلیق کی موجوں کو مضطرب و متلاطم کرنے کے لیے کسی طوفان سے آشنائی لازمی قرار دیتے ہیں اور ایما ویگے ناسٹ کے فراق میں توسیع سے بڑھ کر شدید اور کون سا طوفان ہو سکتا تھا اور پھر ہائیڈل برگ میں ایما سے ملاقات ایک فرد سے ملاقات تھی۔ جبکہ سیاحتِ ہسپانیہ ایک عہد ایک تاریخ اور ایک گم شدہ تہذیب سے ملاقات تھی۔ چنانچہ اقبال سیاحتِ ہسپانیہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کسی چھوڑی ہوئی منزل کی یاد پیچھا کرتی دور تک ساتھ ساتھ ضرور چلی ہوگی اور کھٹک سی تھی جو سینے میں اس کے غم منزل بن جانے کی شعوری مدافعت کے تصرف میں اقبال کی راتیں کبھی سوز وسازِ گوئٹے اور ہائینے اور کبھی پیچ وتابِ کانٹ اور شوپنہار میں ضرور گزری ہوں گی۔ شب و روز کی اس پیچیدہ اور تہ در تہ فکری اور روحانی کشمکش میں ان کی شخصیت بالآخر کسی قلب ماہیت سے گزرنے لگی ہوگی۔ اسی قلب ماہیت کے عمل کے دوران عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور جو زمانے ہیں ان کے ہنگامہ ہائے ہست و بود میں افتاں وخیزاں شاعر و مفکر اقبال کا بغور مشاہدہ کرنے کے نتیجے میں ان کی انگریز پرائیویٹ سیکرٹری اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ اقبال ایک آسمانی وجود ہیں اور اسی انکشاف کے کسی بلیغ اشارے پر خود اقبال بھی اپنی ذات کی جانب متوجہ ہو گئے ہوں گے اور ان پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہوگی کہ وہ اب ہائیڈل برگ کے نوجوان طالب علم نہیں رہے ہیں۔ وہ اب

حجازی شریعتِ حیات اور مشرقی تہذیبی سیاق وسباق کے شاعر، حکیم الامت اور دانائے راز ہیں۔ چنانچہ ان کی اس خودنگری نے ایما کے ساتھ پیمانِ وفا سے یک دم دست برداری کے پیدا کردہ انفعالی احساسِ زیاں کے مقابلے میں ان کو ایک ایسا روحانی سہارا بھی دے دیا ہوگا جس نے ان کے گرتے ہوئے دل کو تھام لیا اور ان کی مجتہدانہ انا کو بھی مطمئن کر دیا تھا۔ تب:

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی　　　اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

اس صدائے جبرئیل کے سوز و گداز اور سرُ ور دو نے اقبال کو اُٹھا کر جلوہ گہِ جبرئیل کے اتنا نزدیک کر دیا کہ ان کا ارضی المیۂ فراق، سماوی طربیہ وصال میں بدل گیا۔ صنف، صنائع بدائع میں اور جنس، جوہرِ تخلیق میں تبدیل ہوگئے اور تزکیہ درتزکیہ ایما، ایما نہ رہی آفاق گیر ایمائیت میں تحلیل ہوکر شاعری میں ظاہر ہوگئی۔ اس کے خدوخال تشبیہ وتمثیل واستعارہ اور رمز وکنایہ میں جلوہ گر ہوکر اُس کمالِ گویائی میں ڈھل گئے جو سنگ وخشت، رنگ وچنگ اور حرف وصوت کو معجزہ ہائے فن ارزانی کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں اس انقلابی مطالعہ جلال وجمال اور ہجر ووصال کے کرشمات اور تعبیر حریر دورنگ کے معجزات ان کی شہرہ آفاق نظم ''مسجد قرطبہ'' میں جس طرح تمثیل گردتصویر کش ہوئے ہیں ان کی مثال محال ہے۔ اس نظم کو اور بہتر طور پر سمجھنے کے لیے آرٹ آف پینٹنگ کی اصطلاح پینٹی منٹو (Pentimento) سے قارئین آیئے استفادہ کرتے ہیں۔

سامعین! آیئے ملاحظہ کیجیے یہ آپ کے قریب ایک پینٹر کے سامنے ایزل پر کینوس ہے۔ اس کینوس پر ایک آئیل پینٹنگ زیرِعمل ہے جو مرحلہ وارفنی مہارت اور چابک دستی کی بدولت پینٹر کی بہت دیرینہ خواہش کی عین تسکین کی طرف تکمیل پذیر ہورہی ہے۔ اس بھرپور تخلیقی بہاؤ کے کسی لمحے میں پینٹر کو اس زیرِعمل تھیم کا کوئی اور ورشن (Version) یا کوئی ایک ایسی ہی تھیم اور سوجھ جاتی ہے۔ جو زیرِعمل تھیم کے مقابلے میں زیادہ جامع، انقلابی اور آفاقی بھی ہے۔ پینٹر اپنے اسلوبیاتی تصرف کے تحت ایک شعوری فیصلہ کرتا ہے اور وہ اپنے کینوس پر اس زیرِعمل تھیم پر اس کا دوسرا ورشن یا تازہ تھیم پینٹ کر دیتا ہے۔ تصویر مکمل ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد قارئین ہم دیکھتے ہیں کہ اوپر پینٹ

کردہ پینٹنگ کے کہیں کہیں نیچے سے نچلی پینٹنگ کے کچھ نقش جھانکنے لگے ہیں یا ظاہر ہو گئے ہیں۔ یہ مظہر پینٹی مینٹو (Pentimento) کہلاتا ہے اور یہ اطالوی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی پچھتاوہ (Repentance) اور مفہوم نمودِ مکرّر (Reappearance) ہے۔

سامعین! یہ پچھتاوہ یا نمودِ مکرر ایما کے ہائیڈل برگ اور اقبال کے ہسپانیہ کے مابین اشتراک و اعتبارِ من وتو کے تحت خوشگوار تبادلۂ ظلال وعکوس کرتا نظر آتا ہے۔ ایما سے ملاقات کی اقبال کی 23 برسوں پر محیط خواہش پوری ہونے میں جب چند دن ہی رہ گئے تھے تو یہ اچانک اتفاق ہوا کہ اقبال کے سامنے سیاحتِ ہسپانیہ کا نادر موقع پیدا ہو گیا۔ اقبال نے ایما سے ملاقات پر سیاحتِ ہسپانیہ کو ترجیح دے دی۔ چنانچہ ایما سے ملاقات کی دیرینہ خواہش کو ثانوی درجہ دینے کے اقبال کے اختیاری اور شعوری فیصلے سے ایما اقبال کے تحت الشعور میں چلی گئی۔ جہاں سے آگے وہ لاشعور میں اُتر گئی۔ اس لاشعور سے وہ اب اقبال کی سیاحتِ ہسپانیہ میں قدم قدم پر نت نئے تجربات و مشاہدات کی مناسبت ومماثلت سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہو ہو کر اپنے اظہارِ وفا کے ہر موقعہ کی تلاش میں ہمہ وقت بے قرار اور تیار تھی۔ چنانچہ جب دریائے الکبیر کے کناروں پر آباد قرطبہ شہر کے اُفق پر غرقِ شفق سحاب ہوا اور ماضی کے مسلم ہسپانیہ کے علمی تناظر پر آفتاب لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا تو دریائے نیکر کے کناروں پر آباد ہائیڈل برگ شہر کی شاموں میں ہم قدم، ہم خیال اور ہم احساس ایما نے دریا آرنو کے کناروں پر آباد فلورنس شہر کے شاعر دانتے کی بیاتراچے کا وجدانی پیرہن پہن لیا اور سلسلۂ روز وشب کے آوازۂ افلاک گیر مین دخترِ دہقاں کے سادہ و پرسوز گیت کی گونج بن کر وہ شاعر اقبال کا پرکسک شعری پیرایہ بن گئی اور مسجد قرطبہ کے لافانی جاہ وجلال اور حسن و جمال سے متعصّبانہ اغماض اور حریفانہ صرفِ نظر کے صدیوں پر محیط نصرانی رویوں کے خلاف اقبال کے تخلیقی احتجاج میں اُس نے راہ پالی اور کارِ جہاں بے ثبات کے شہرہ وشور میں ادبِ عالیہ کے صفحات پر شاعر اقبال ''مسجد قرطبہ'' جیسی لافانی نظم کہتا ہے اور فلسفی شاعر اقبال آبِ روانِ کبیر کے کنارے نشاۃِ ثانیہ کا خواب دیکھتا ہے!